ہاں تو میرے جیل سے رہا ہونے کا دن آپہنچا۔ مجھے اب اندازہ ہوا کہ میں قیدیوں میں کتنا 'پاپولر' ہوگیا تھا۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ میں نے ان کے بہت سے جھگڑے نپٹائے تھے۔ معمولی معمولی سہولتوں کے لئے جیلر اور سپرنٹنڈنٹ سے ان کی باتیں منوائی تھیں۔ اتفاق کی بات یہ تھی کہ جیل سپرنٹنڈنٹ بڑے نرم دل تھے۔ وہ دراصل ضلع اسپتال میں سول سرجن تھے ـــــ اور اس زمانے میں سول سرجن ہی جیل سپرنٹنڈنٹ کے فرائض انجام دیتا تھا۔ ایک بار جیل میں کھانے کے سلسلے میں بھوک ہڑتال بھی ہوگئی تھی۔ اس زمانے میں یہ بات غیر معمولی تھی۔ پورے ضلع کی انتظامیہ حرکت میں آگئی اور بالآخر معاملات خوش اسلوبی سے طے ہوگئے اور جیل کے کھانے کی کوالٹی بہت بہتر ہوگئی۔ میرے سامنے وارڈر کے تشدد بھی ختم ہوگئے تھے۔ اس روز مجھے ایسا لگا کہ گویا میں اپنا گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں اور سچ بھی یہ ہے کہ انسان جہاں بھی رہنے لگے وہی اس کا گھر ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کہیں آدمی سال بھر رہتا ہے تو کہیں دس بیس سال ـــــ یہ تمام گھر عارضی قیام گاہ ہیں۔ اسی لئے بوڑھی عورتیں اسے "رین بسیرا" کہا کرتی ہیں۔ یہ سچ ہے کہ رہائی کی وجہ سے میں خوش بھی تھا لیکن وہاں در و دیوار اتنے مانوس ہوگئے تھے کہ ان کے چھٹنے کا ملال بھی تھا۔ میں نے اس ماحول میں ایک اک لمحہ بہت سوچ سمجھ کر خرچ کیا تھا۔ یہاں کا ایک اک ذرہ مجھ سے مانوس تھا پھر وہ لوگ جن سے صبح شام کا واسطہ تھا، وہ بھی تو میرے اپنے ہوگئے تھے۔ سب اداس تھے۔ سب مجھے رخصت کر رہے تھے۔ انسانوں کا یہ رشتہ کتنا عجیب ہے۔ ان میں بیشتر وہ لوگ تھے جو مجرمانہ حرکتوں کی بنا پر یہاں آئے تھے۔ لیکن نیکی، شرافت، دردمندی، محبت اور خلوص ان کے چہروں سے نمایاں طور پر دکھائی دے رہی تھی۔ بھلا ان کو دیکھ کر کوئی انسان سے مایوس ہو سکتا ہے۔ میں جب وہاں سے رخصت ہوا تو میری آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ مجھے ان کے چہرے نظر نہیں آرہے تھے لیکن ان کے دلوں کی دھڑکن مجھے اپنے کانوں سے سنائی دے رہی تھی۔ جیلر نے اس روز قیدیوں کو خاصی چھوٹ دے رکھی تھی سب لوگ اپنے اپنے کام چھوڑ کر مجھے رخصت کر رہے تھے لیکن کسی کی زبان سے کوئی لفظ نہیں نکلا لیکن میرے کانوں میں ایک آواز آئی "خدا حافظ" ـــــ مڑ کر دیکھا تو سب کے سب خاموش تھے ـــــ جیل کا آہنی پھاٹک کھلا۔ سب لوگوں نے محبت سے رخصت کیا۔ شنکر خاص طور پر جیلر صاحب کی اجازت سے